اقبال کی فلسفہ خودی

اقبال کو یقین تھا کہ ہر انسان میں کچھ پوشیدہ صلاحیتیں ضرور موجود ہوتی ہیں۔ اس کا فرض ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کا پتا لگائے۔ یہ عمل خود شناسی یا عرفانِ ذات کہلاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ان صلاحیتوں کو مستحکم کیا جائے۔ مطلب یہ کہ انھیں سنوارا اور نکھارا جائے اسے استحکام خودی کہا جاتا ہے۔ استحکام خودی کے لیے اقبال مختلف تدبیریں بتاتے ہیں جن میں سب سے اہم ہے عشق۔ مطلب یہ کہ انسان کے سامنے کوئی اہم مقصد ہونا چاہیے جس کو پورا کرنے کے لیے اس کے دل میں ایسی تڑپ ہو جیسی عشق میں ہوتی ہے۔ ایسی لگن کے بغیر انسان کسی مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ عقل اس راستے میں رکاوٹ بنتی ہے اور خطروں سے ڈراتی ہے لیکن عشق اس کے مشوروں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اقبال نے کتنی سچ بات کہی ہے کہ جب عقل لبِ بام محوِ تماشا ہوتی ہے تو عشق بے خطر آگ میں کود پڑتا ہے۔ 'ساقی نامہ' میں اور اس سے بھی زیادہ مسجد قرطبہ میں عشق کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

دوسری اہم چیز جہد و عمل ہے جس سے خودی محکم ہوتی ہے۔ مسلسل کوشش کے بغیر انسان اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے مختلف تشبیہوں کا سہارا لیا ہے۔ موجِ دریا کہتی ہے کہ میں اسی وقت تک زندہ ہوں جب تک گردش میں رہوں۔ آرام میری موت ہے۔ چاند جو ستاروں کا قافلہ سالار ہے ستاروں کو سمجھاتا ہے ـــــ

گردش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

شاہین کے اقبال اس لیے مداح ہیں کہ وہ بلند پرواز ہے۔ تیز نظر ہے اور دوسرے کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ ابلیس کے اقبال اس لیے قائل ہیں کہ ایک تو اس کا عشق اتنا سچا ہے کہ خدا کے حکم پر بھی خدا کے سوا کسی اور کو

REDMI NOTE 8
AI QUAD CAMERA

سجدہ نہیں کرتا۔ دوسرے ہر وقت جدوجہد میں لگا رہتا ہے۔ ذرا دیر کو بھی آرام نہیں کرتا اور خود اس کے اپنے الفاظ میں "مجھے تو جھے کی چھٹی بھی نہیں ملتی" اس سلسلے میں اقبال کی نظم جبریل و ابلیس خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ابلیس جبریل کو طعنہ دیتا ہے کہ میں تو طوفانی موجوں کا مقابلہ کرتا ہوں اور تو بس ساحل سے تماشا دیکھتا رہتا ہے۔

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر　　کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو

استحکامِ خودی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان بے عمل ہو کر محض تقدیر پر بھروسا نہ کرے، سراپا عمل بن جائے کیونکہ جہدِ عمل تو وہ شے ہے جس سے انسان کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں ستاروں کی گردش انسان کی قسمت بناتی اور بگاڑتی ہے۔ اقبال ستارے پر طنز کرتے ہیں کہ وہ بیچارہ میری تقدیر کا حال کیا بتائے گا۔ وہ تو خود آسمان کے میدان میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔

فقر و استغنا سے بھی خودی مستحکم ہوتی ہے۔ فقر سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ انسان کسی کا محتاج نہ ہو اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرے۔ ایک نظم میں اپنے بیٹے جاوید کو نصیحت کرتے ہیں کہ "خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر" اور وہ اس طرح کر ــــــ

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں　　سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

پیامی شاعری میں مایوسی اور نا امیدی کی گنجائش نہیں۔ نا امیدی انسان کے حوصلے پست کر دیتی ہے۔ اقبال امید کے شاعر ہیں اور بار بار ہمت نہ ہارنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ اپنی قوم سے مایوس نہیں۔ انھیں یقین ہے کہ یہ مٹی بہت زرخیز ہے۔ بس چند بوندوں کی ضرورت ہے کیونکہ ذرا سی نمی پا کر قوم کی کھیتی پھر سے لہلہا اٹھے گی۔

استحکامِ خودی کے لیے ایک نہایت اہم شے ہے مردِ کامل کی پیروی۔ مردِ کامل سے اقبال کی مراد ہے رسولِ اکرم۔ جو بزرگ ان کے نقشِ قدم پر چلے ہمیں ان بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے ہم میں صفاتِ الٰہی پیدا ہو جائیں گی اور ہمیں مردِ مومن کا رتبہ حاصل ہو جائے گا۔ مردِ مومن کی شان یہ ہے کہ جب اس کا ہاتھ اٹھتا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اٹھتا ہے ــــــ

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

اس طرح انسان کی خودی مکمل ہو جاتی ہے، وہ عمل کا پُتلا بن جاتا ہے اور پھر سارا جہاں اس کے

زیرِ فرمان ہوتا ہے۔ وہ نہ خود مٹ سکتا ہے نہ اس کے کارنامے فنا ہو سکتے ہیں۔ "مسجد قرطبہ" میں اقبال نے واضح کیا ہے کہ یہ عظیم الشان مسجد مردِ مومن کا کارنامہ ہے اور اس لیے لازوال ہے۔

اقبال نے خودی کے ساتھ بے خودی کا تصور بھی پیش کیا۔ خودی کا تعلق فرد سے ہے لیکن فرد پوری ملت کا ایک حصہ ہے۔ ملت کے تمام افراد کی خودی پوری ملت کی خودی میں ضم ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام بے خودی ہے اور یہی خودی کا آخری مرحلہ ہے۔

اقبال نے اپنی نظموں میں اپنا یہ فلسفہ اس طرح پیش کیا ہے کہ اس سے شاعری کے حسن میں کمی نہیں آئی بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اکثر کہا گیا کہ فلسفہ و فکر سے شاعری کا حسن مجروح ہوتا ہے اور تاثیر میں کمی ہو جاتی ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ شاعری خود کو فلسفہ و پیغام سے دور ہی رکھے لیکن ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا یہ ارشاد حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے کہ فلسفے سے نہ شاعری کا رتبہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے لیکن فلسفے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شاعر نے شعری آداب کا لحاظ رکھا ہے یا نہیں۔ اگر رکھا ہے تو فلسفہ و فکر عیب نہیں حسن ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ایلیٹ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار فرمایا ہے کہ "فکر سے فن کو آب و تاب ملتی ہے۔" اور اردو شاعری کو اقبال کی یہی عطائے خاص ہے۔